بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اسلام کی ابتدا ایک آئیڈیالوجی یعنی ایک نظریۂ حیات سے ہوئی، جو شروع شروع میں مشتمل تھا اللہ تعالیٰ کی توحید اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دعوت پہلے سرّاً پھر جہراً عام ہوئی اور جب اہل مکہ کی ایک مختصر سی تعداد نے اس دعوتِ ربّانی کو قبول کر لیا۔ اور مسلمانوں کی ایک جماعت وجود میں آگئی تو اسی وقت سے ایک اسلامی معاشرہ کا قیام عمل میں آگیا۔ ایک معاشرے کو قائم رکھنے، اس کے داخلی ضبط و استحکام کو بڑھانے اور گرد و پیش کے غیر مسلم معاشرے سے اس کے تعلقات کیسے ہوں، اس کے بارے میں جن اصولوں، قاعدوں اور احکام کی ضرورت ہوتی ہے، ان کا ساتھ ساتھ نزول اور ظہور ہوتا گیا۔ یہ صورت حال مکہ معظمہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ مکہ معظمہ میں اسلامی معاشرہ ایک مربوط، مضبوط اور اپنی جگہ ایک مستقل معاشرہ تھا، جس کے اپنے احکام تھے، قوانین تھے اور طریقہ ہائے کار تھے۔

مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی معاشرہ ایک اسلامی مملکت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس مملکت کی حدیں پہلے صرف مدینہ تک تھیں۔ بلکہ خود مدینہ تک میں اسے کامل سیادت حاصل نہ تھی، لیکن "منافقین" کا زور ٹوٹنے اور مدینہ کے تین بڑے یہودی قبائل کے وہاں سے نکل جانے کے بعد مدینہ کی اسلامی ریاست کو پورا داخلی غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد اردگرد کے قبائل اس ریاست کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ پھر اس کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ ہجرت کو ابھی ۸ سال نہ گزرے تھے کہ مکہ نے مدنی ریاست کے سامنے ہتھیار ڈال

دیئے۔ اس کے دو برس بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو سارا جزیرۂ عرب علمِ اسلام کے تحت آچکا تھا، اور مسلمانوں کی ایک فوج قسطنطنیہ کے قیصر کی افواج سے ٹکر لینے کے لئے جزیرۂ عرب کے انتہائی شمال میں پہنچ چکی تھی۔

خلافت راشدہ میں اسلامی فتوحات نے ایران، شام اور مصر کو نئی مملکت میں شامل کر لیا۔ اموی دور میں سندھ سے لے کر اسپین تک اور ادھر ترکستان سے لے کر وسط افریقہ تک مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس عہد میں یہ سلطنت دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی سلطنت تھی۔ بے شک سیاسی غلبہ نے مسلمانوں کو ملکوں، قوموں اور خطوں کا حکمران بنا دیا۔ اور ان کا سکّہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر چلنے لگا۔ لیکن یہ نئے دین کا ایک پہلو تھا۔ گو اس پہلو کی تاب ناکی اور عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن اس دین کا ایک اور پہلو بھی اس سیاسی توسیع و اقتدار کے ساتھ ساتھ برابر اجاگر ہوتا گیا اور وہ یہ کہ جہاں جہاں مسلمان فوجیں پہنچیں، وہاں کے لوگ اسلام سے واقف ہوتے گئے۔ اور اس کی روشنی سے وہ سب اندھیرے چھٹ گئے، جنہوں نے ان قوموں کو غلط عقائد اور رسوا کن رسموں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس طرح اسلام کو پھیلنے میں مدد ملی۔ اور ہجرت سے ایک صدی سے کچھ عرصہ بعد انہی لوگوں نے جو اموی دور میں عربوں کے ہاتھوں محکوم ہوئے تھے، مسلمانوں کی حیثیت سے عباسیوں کے ساتھ مل کر امویوں کا تختہ اُلٹ دیا اور عباسیوں کے ساتھ برابر کے شریک ہو کر حکومت کرنے لگے۔ یہ اسلام کا بہت بڑا تاریخی اعجاز تھا۔ اور داعیٔ اسلام کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ثبوت۔

اموی دور میں سیاسی اقتدار کو برتری و سربلندی حاصل تھی۔ اور یہ سیاسی اقتدار خالص عربوں کا تھا۔ عباسیوں کے برسر اقتدار آنے سے یہ نقشہ بدل گیا۔ ایک تو سیاسی اقتدار میں عربوں کے ساتھ ایرانی اور بعد میں ترک مسلمان شریک ہو گئے۔ شروع میں کم اور آگے چل کر کچھ زیادہ اور آخر میں بہت زیادہ۔ دوسرے عربوں کے علاوہ بہت سی اور غیر عرب قوموں کے مسلمان ہونے، ان کے عربی زبان کو اپنانے اور اسے اپنی مادری زبان بنا لینے، نیز عربی زبان میں دینی علوم مثلاً تفسیر، فقہ، حدیث، کلام اور اس طرح کے بے شمار اور شعبہ ہائے علم دینی کے علاوہ دوسرے علوم، جیسے تاریخ، فلسفہ، طبیعیات، ریاضیات اور ایسے ہی بے حد و حساب اور علوم دینوی کے انتشار اور فروغ سے ایک خاص ذہنی فضا پیدا ہو گئی، جو اسلامی

بھی تھی، اور عالمی بھی۔ اور وہ اس لئے کہ اگرچہ اس کی بنیاد قرآن و سنت اور فقہ و کلام پر اور ان کی مختلف تعبیرات پر تھی، لیکن ایک تو اس کی تشکیل میں اس وقت کی تمام قوموں نے حصہ لیا تھا، اور دوسرے ان سب قوموں کے مختلف علوم ترجمہ ہو کر عربی میں آ گئے تھے۔ نیز اس دور میں یہ سب قومیں مل جل کر رہنے لگی تھیں۔ اور ان سب کے تمدنوں کے دھارے جو صدیوں سے الگ الگ بہہ رہے تھے۔ اس عالمی تمدن و تہذیب میں جو عباسیوں کے عہد میں پہلے بغداد میں اور بعد میں دوسرے مرکزوں میں وجود پذیر ہوئی، جمع ہوتے گئے۔ اور وہ عالمی اور بین الاقوامی ثقافت پروان چڑھی، جسے تاریخ میں اسلامی ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ثقافت کی زبان شروع میں عربی تھی۔ پھر فارسی زبان بھی اس میں شریک ہو گئی۔ بعد میں ترکی زبان نے اس میں سے اپنا حصہ لیا۔ خود اس برصغیر میں پہلے فارسی اس ثقافت کی زبان تھی۔ اب ایک صدی سے اس منصب میں حصہ دار بننے کے لئے اردو زبان بھی کوشاں ہے۔ اس ثقافت کو اپنے اپنے وقت پر ہر مسلمان قوم نے اپنایا اور اس کی قومی زبان اس کی ترجمان بنی۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی اس ثقافت کی تشکیل میں اسلامی تاریخ کے تمام ادوار کا حصہ ہے۔ اور اس کی بنیاد جیسا کہ اوپر عرض کر آئے ہیں، مکہ معظمہ میں رکھی گئی۔ پھر مدینہ منورہ میں اسے مملکت کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ لیکن اس ثقافت کا پھیلاؤ بغداد سے شروع ہوتا ہے اور یہ سب قوموں کی صالحات کو اپنے اندر لے کر ایک عالمی اور بین الاقوامی حیثیت اختیار کرتی ہے۔

یہی وہ ثقافت تھی کہ تاتاری غارتگر دنیائے اسلام کے بہت بڑے حصے کو مفتوح و محکوم کرنے کے بعد خود اس کے محکوم ہو گئے۔ اور اس کی بدولت اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ اسی ثقافت سے متاثر ہو کر صلیبی حملہ آور جب واپس یورپ گئے تو یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور وہاں کے لوگ قرون مظلمہ کے اندھیروں سے نکلے۔ یہ ثقافت کوئی آٹھ سو سال تک دنیا کی تمام ثقافتوں سے بالاتر اور ترقی یافتہ رہی۔ اور اس سے بہرہ ور ہونا تہذیب و ترقی کی علامت سمجھا جاتا رہا۔ ایک مسلمان خواہ وہ کسی ملک یا قوم سے تعلق رکھتا، اس ثقافت کا اپنی علمی و تہذیبی حیثیت کے مطابق تو حصہ دار ہوتا ہی، لیکن دوسرے مذاہب والے لوگ بھی اس ثقافت کو اپناتے تھے۔ عباسی عہد میں غیر مسلم ادیب، فلسفی اور طبیب عربی زبان میں لکھتے۔ مسلمانوں ہی کی طرح رہتے۔ اور ان میں اور مسلمانوں میں

بظاہر کوئی فرق نہ ہوتا، اس کی مثال آج آپ کو مصر، شام، عراق اور دوسرے مسلمان ملکوں میں مل سکتی ہے۔ وہاں کے عیسائی عربی بولتے اور عربی ہی میں دینی عبادات کی دعائیں پڑھتے ہیں۔ اور عیسائی ادیب آپ کو مسلمان ادیبوں سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ملیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے نام بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کے لئے ان میں ان کے ناموں کے ذریعہ مسلمان اور غیر مسلم کی تمیز کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نمونہ ہے اس ثقافت کی سربلندی اور ہمہ گیری کا، جسے مسلمانوں نے اپنے دورِ اقبال میں پروان چڑھایا، اور زوال کی موجودہ صدیوں میں بھی وہ ایک حد تک مسلمانوں کی قومی تشخص کا ذریعہ بنی رہی۔ مصر میں ایک بڑا مشہور قبطی یعنی قدیم مصری عیسائی قومی رہنما مکرم عبید تھا۔ اسے سعد زغلول کے ساتھ قومی جدوجہد میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا، اسے اپنے زمانے میں سب سے بڑا سیاسی خطیب سمجھا جاتا تھا اور ظاہر ہے یہ عربی زبان کا ہی خطیب تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا: "انا مسیحی دیناً و مسلم وطناً" (میں مذہباً تو عیسائی ہوں لیکن وطناً مسلمان ہوں) اور وطناً مسلمان ہونے کے معنی یہ تھے کہ تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے وہ اور ایک مصری مسلمان برابر تھے اور ان میں فرق کرنا مشکل تھا۔

×

ایک زمانے میں ہماری یہ ثقافت عالمی اور بین الاقوامی ثقافت تھی۔ اور اس کے رنگ میں رنگا جانا یا اس سے انتساب ایک وجہ امتیاز تھی۔ پچھلی دو صدیوں میں جب سے یورپی اقوام کو غلبہ حاصل ہوا ہے، ہماری ثقافت کی بین الاقوامی حیثیت کچھ گہنا سی گئی ہے۔ لیکن ایشیا اور افریقہ میں آزادی کی تحریکوں کے فروغ اور ان کی کامیابی کے بعد یورپ کی ثقافت کی وہ بالاتری قائم نہیں رہی، اور اب افریشیائی اقوام کی ثقافتیں سر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بے شک ہر ملک میں اپنی قومی ثقافت پر زور دیا جا رہا ہے۔ اور ہر حکومت اسے ترقی دینے میں کوشاں ہے۔ اور یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ ایک قوم کی قومی تشخص اس رقبۂ زمین سے نہیں ہوتی، جس میں وہ قوم آباد ہوتی ہے بلکہ اس قوم کی ثقافت اسے قومی تشخص عطا کرتی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی نو آزاد قومیں لازماً اپنی قومی تشخص کو اُجاگر اور پائدار بنانے کے لئے اپنی اپنی قومی ثقافتوں کو فروغ دیں گی۔ اور ان کی سیاسی آزادی کا یہ لازمہ ہے۔ اور اس پر کسی کو چیں بہ جبیں نہیں ہونا چاہیئے۔ قوموں کا اظہارِ ذات اسی طرح ہی ہوتا ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان ملک یعنی وہ ملک جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے

اور یہ اکثریت ان کے سیاسی اقتدار میں بھی پوری طرح اثر انداز ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ملک جہاں مسلمان حاکم ہیں، اور مسلمان عوام کی رائے عامہ وہاں کے سیاہ وسفید کی مالک ہے۔ کیا وہاں جب قومی ثقافتوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور یورپی اقوام کے غلبہ وسیادت نے ان میں جو احساس پستی اور نفی ذات کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، وہ ختم ہو جائے گا اور یہ مسلمان ملک خود اپنے آپ میں آجائیں گے، تو کیا وہاں کی قومی ثقافتوں میں باہم کسی قسم کا اشتراک رہے گا، جسے ہم اسلامی ثقافت کہہ سکیں۔ یہ سوال اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ اور اسی پر دوسرے مسلمان ملکوں اور بالخصوص پاکستان کی اسلامی قومی تشخص کا انحصار ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہو جانی چاہیئے کہ نو آزاد مسلمان ملکوں میں جہاں قومی سیادت، قومی سربلندی، قومی مقاصد ومصالح اور قومی معیشت پر زور دیا جائے گا اور ایسا ہونا فطری بھی ہے اور ضروری بھی۔ کیونکہ صدیوں سے ہمارے ہاں ان امور کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اور اسی کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں پس ماندہ ہو کر رہ گئے، اور غیر قوموں نے ہمیں اپنا غلام بنالیا۔ وہاں قومی ثقافتوں کو بڑی اہمیت دی جائے گی۔ اور قومی زبان، قومی تاریخ، قومی روایات، قومی تہذیب اور دین کو بھی جو ظاہر ہے کبھی قومی نہیں ہو سکتا، اور بالخصوص دین اسلام، قومی بنا کر آگے لایا جائے گا۔ اتاترک سے پہلے بھی اور اس کے دور میں تو خاص کر ترکی میں ایسا ہوا۔ اور اب اکثر عرب ملکوں میں اس نہج پر سوچا جاتا اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ ان ملکوں میں اس کا ردّ عمل بھی ہوا ہے۔ عربوں میں اخوان مسلموں کی تحریک کی شکل میں اور ترکی میں اسی قسم کی بعض دوسری تحریکوں کے رنگ میں۔ یہ تحریکیں جو مسلمان ملکوں کے قوم پرستانہ رجحانات کے خلاف شدید نوع کے ردّ عمل کے طور پر چل رہی ہیں۔ ان میں نفس قومیت کی نفی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اور اسے اسلامیت کے منافی ثابت کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ اب اگر پہلا گروہ ایک انتہا پر ہے تو یہ دوسرا گروہ دوسری انتہا پر ہے اور بدقسمتی سے ان میں سخت قسم کی کشمکش جاری ہے۔

خدا کا فضل ہے کہ پاکستان اس معاملے میں اس افراط وتفریط سے محفوظ ہے۔ اور یہاں دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح قومیت اور اسلامیت میں باہم ٹکراؤ نہیں ہو رہا۔ لیکن اس کے بجائے ہم میں قدامت پسندی اور تجدد پسندی کی خلیج ضرور موجود ہے، اور وہ جیسے جیسے ہمارے ہاں صنعتوں کے فروغ کی وجہ سے اجتماعی وانفرادی زندگی بدل رہی ہے، زیادہ گہری اور وسیع ہوتی جا رہی ہے اور اسے پُر کرنے کی اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں، وہ بالکل ناکام رہی ہیں۔ اس ناکامی کی کوئی بھی وجہ ہو، لیکن

یہ ثقافت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اور جسے ہم نے اسلامی ثقافت کا نام دیا ہے، اور جو ہمارے نزدیک ایک عالمی اور بین الاقوامی ثقافت تھی، اور جس کا کوئی آٹھ سو سال تک دنیا میں سکّہ رواں رہا، ان معنوں میں خالص دینی ثقافت نہ تھی، جیسے ہمارے بعض بزرگ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے شک اس ثقافت کی اخلاقی روح دین سے مستفاد اور متاثر تھی، لیکن اس کی نشوونما میں جہاں دین محرک اساسی تھا، اور اس نے اسے ایک بلند تر نصب العین (آئیڈیل)، اعلیٰ اخلاقی قدریں، مثبت جذبۂ عمل اور بامعنی نظامِ فکر دیا۔ وہاں عرب کے دورِ جاہلیت کے ادب، ایران کے سیاسی و تہذیبی اداروں، یونانی علوم، ہندوستانی حکمت اور معلوم نہیں اور کتنی قوموں کی روایات نے اس ثقافت کو وہ معنوی مواد اور خارجی ہیئت دی، جس کے طفیل وہ دنیا کی سب سے زیادہ ہمہ گیر، سب سے بڑھ کر ترقی یافتہ اور سب سے فعال ثقافت بن سکی۔ ہمیں اس اسلامی ثقافت کی ان حیثیتوں کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہئے۔ یہ ایک جامع ثقافت تھی۔ اچھی چیزوں کو اپنے اندر سمونے والی اور انہیں اپنانے والی۔ چھوت چھات اور دوسروں سے دُور بھاگنے کو اس نے ہمیشہ مذموم قرار دیا۔ اس نے ہر اچھائی کو اپنا گم شدہ مال سمجھا۔ اور جس طرح اس کی ساری تاریخ میں نسل اور رنگ کے امتیاز کو کبھی قبولیت نہ ملی۔ اسی طرح وہ دوسری قوموں کی اچھائیوں کو اخذ کرنے میں بخل کی کبھی روادار نہیں ہوئی۔ اس ثقافت کا مزاج اخذ و مواخذہ کا تھا، قطع و انقطاع کا نہیں۔

یہ ثقافت خالص دینی زندگی میں بھی کارفرما رہی۔ انفرادی و اجتماعی معاملات میں بھی۔ سیاست و معیشت بھی اس سے متاثر ہوئے۔ عام تہذیب و تمدن میں بھی اس کی عکاسی ہوئی۔ ادب و آرٹ اور علوم و فنون سب میں اس کے اثرات و نقوش موجود ہیں۔ اس ثقافت کو جب محدود کر لیا گیا۔ اور ان سب شعبوں کو اس سے نکال دیا گیا تو دراصل اس ثقافت کا زوال اور اس کے ساتھ ساتھ تمام مسلمان اقوام کا زوال اس وقت سے شروع ہوا۔

×

پاکستان اب ایک آزاد اسلامی مملکت ہے، اور صدیوں کے بعد یہاں کے عوام کو اپنی قسمت کو خود اپنے ہاتھ سے بنانے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ ان حالات میں لازمی ہے کہ یہاں قومی ضرورتوں، قومی مفاد و مصالح اور قومی معیشت و سیاست کو اہمیت دی جائے، اور اس کے مطابق اس کی پالیسیاں وضع ہوں، ایسا ہوگا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن یہ کام تو ایک قومی ریاست بھی کرتی ہے۔ آخر پاکستان کی جو ایک اسلامی جمہوریت ہے، اس ضمن میں کیا خصوصیت ہوئی۔

پاکستان کو ایک مسلمان ملک کی حیثیت سے اس اسلامی ثقافت سے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں، حصّہ

وافر ملا ہے۔ اہلِ پاکستان کی غالب اکثریت کا دین اسلام ہے۔ اور اسلام صرف چند معتقدات کا نام نہیں اور نہ یہ عبارت ہے محض عبادات اور احکام اور رسوم سے۔ بلکہ اسلام ایک تاریخ ہے، ایک ثقافت ہے اور ایک اجتماعی نظام اور انفرادی ضابطوں کا مجموعہ ہے، جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اور ہماری قومی زندگی میں اس طرح رس بس گیا ہے کہ وہ ہم میں سے ہے اور ہم اس میں سے ہیں۔ اور دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ پاکستان شاہراہِ زندگی میں جیسے جیسے آگے قدم اٹھائے وہ اسلام اور اس کی اس تاریخ و ثقافت کو ساتھ لے کر آگے بڑھے۔ کیونکہ یہ سب ہماری ذات کا ایک حصہ ہیں۔ اور اس کی نفی خود ہماری ذات کی نفی ہوگی۔ یہ ہمارے عائلی قوانین ہوں، یا معیشت و سیاست کے اصول و قواعد، اجتماعی اخلاقی ضابطے ہوں یا افراد کے معیارِ حُسن و قبح۔ ان چیزوں کو ان محدود دینی نظروں سے دیکھنا، جس کا ہمارے بزرگ علماء کی طرف سے ہر وقت تقاضا ہوتا ہے، مشکلات پیدا کرے گا دراصل ایک ہے دین۔ دین کے اصول، اس کی مستقل قدریں اور اس کے معیارِ عمل۔ اور دوسری چیز ان کا اجتماعی زندگی میں نفاذ ہوتا ہے۔ جس کا عملی ظہور تاریخ میں ہوا۔ ثقافت میں ہوا۔ اور اپنے اپنے وقت میں مسلمان قوموں نے اسے اپنایا۔ پہلی چیز ہمیشہ سے ایک ہے، ایک رہے گی۔ اور سب کے لئے وہی واحد نصب العین ہے۔ اور دوسری چیز میں حالات، زمانے اور قوموں کے لحاظ سے فرق ہوتا رہے گا۔

ماہ اپریل کے "فکر و نظر" میں بتایا گیا تھا کہ مختلف مسلمان ملکوں نے اپنے ہاں مختلف عائلی قوانین نافذ کئے ہیں۔ اور ان میں سے شائد ہی ایک آدھ قانون ہو، جس کی سند نہ مل سکے۔ اب ثقافتی و تمدنی اعتبار سے ان ملکوں میں اتفاق سے تونس سب سے آگے ہے۔ چنانچہ وہاں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں عورتوں کو نکاح و طلاق میں زیادہ آزادی دی گئی ہے۔ مصر کی دیہاتی زندگی ہمارے ہاں سے بھی پسماندہ تر ہے۔ چنانچہ وہاں جو عائلی قانون صدر ناصر کی حکومت نے نافذ کئے ہیں، وہ ہم سے بھی پیچھے ہیں۔ مراکش کافی عرصہ فرانس کے زیرِ اثر رہا، جس سے وہاں کا معاشرہ متاثر ہوا، چنانچہ تونس کے بعد سب سے زیادہ نکاح و طلاق کے معاملے میں وہاں کی عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ مسلمان ملک جہاں ابھی عورتوں کو عام تعلیم کی سہولتیں میسر نہیں، اور وہاں پردے کی پابندیاں زیادہ ہیں، وہاں عائلی قوانین حسبِ سابق جاری ہیں اور ان کے خلاف احتجاج نہیں ہوتا۔

غرض دین کے معتقدات اور اس کی عبادات و احکام میں تو تبدیلی کرنے یا ان کی تعبیرِ جدید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، باقی ہمیں اپنی تاریخ اور اپنی ثقافت کے سلسلے کو ان معنوں میں جو ہم نے اوپر بیان کئے، جاری رکھتے ہوئے آگے بڑھنا ہے اور یہ ممکن ہے اور ہمیں اپنی انفرادی و قومی زندگی میں اسے عملاً ممکن بنانا ہے۔